دارالعلوم کورنگی میں مغربی فکر و فلسفے کی تعلیم کیوں روک دی گئی؟

مفتی شفیعؒ، محمد حسن عسکریؒ، محمد تقی عثمانی اور رینے گینوں اہم جائزہ

برعظیم پاک و ہند میں گزشتہ دوعشروں سے مشرق ومغرب کی کشمکش جاری وساری ہے۔ اس کشمکش میں علمی طور پر شریک افراد میں محمد حسن عسکریؒ کا نام اہم ترین ہے۔ عسکری صاحب نے ترقی پسند ادب سے روایت پسند فکر تک جو سفر طے کیا اس کی بے شمار منزلیں ہیں اور ہر منزل ایک نئے سفر اور ایک نئے فکر کا عنوان بن جاتی ہے۔ اردو زبان وادب کی تاریخ کو انگریزی فکری اثرات سے آزاد کرانے کا سہرا عسکری صاحب کے سر ہے جنھوں نے فرانسیسی ادبی روایت اور روایت کے مکتبہ فکر کے زیرِ اثر اردو زبان وادب کا رشتہ دینی روایات سے جوڑ دیا۔ وہ ادب سے دین کے کوچے میں آئے تھے لہٰذا ان کی تحریروں کے سنجیدہ قارئین کو شکوہ رہتا تھا کہ عسکری ''اچھے خاصے علمی مضمون کو کرخنداروں کی زبان میں ادا کر کے متبذل بنا دیتا ہے''۔ اس کا جواب عسکری صاحب نے اپنے مخصوص استہزائیہ انداز میں دیا ہے کہ ''لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ بڑے بڑے نظریوں اور مذاہب پر غور کرتے ہوئے میں نے عام طور پر ان کے صحیح ترین تصور کے بجائے مقبول ترین تصور کو پیش نظر رکھا ہے''۔ زبان معلّی کے بجائے زبان محلّہ پر عسکری صاحب کا اصرار مطالعے کا دلچسپ موضوع ہے۔

فرانسیسی زبان، ابن عربیؒ اور رینے گینوں نے عسکریؒ کے سفر کی سمت مغرب سے مشرق کی طرف موڑ دی۔ ۱۹۵۷ء تک عسکری صاحب نے کوئی دینی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ دین کا علم انھیں ابن عربیؒ اور رینے گینوں کے ذریعے حاصل ہوا اور مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات بھی اس ذہنی سفر میں پیش نظر رہے لیکن ان کے عشق نے زمین وآسمان کی وسعتوں کو لمحوں میں طے کرلیا۔ اس لیے بعض لوگ کہتے ہیں کہ عسکری صاحب کو ''مشرق بھی مغرب کے ذریعے ملا ہے''۔ عسکری صاحب ڈاکٹر حمیداللہ کے نام خط میں بلاتکلف اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ [..........انھوں نے میرے مضمون کو پسند کیا تو مجھے دو وجہ سے خوشی ہوئی۔ ایک تو یہ کہ وہ میرے دینی بھائی ہیں۔ دوسرے اس وجہ سے کہ میں نے جو کچھ سیکھا ہے فرانس سے سیکھا ہے۔ اردو شاعری بھی میں نے اس وقت سمجھی ہے کہ جب فرانسیسی شاعری پڑھی ہے۔ اسلام اور تصوف کو اس وقت سے سمجھا ہے کہ جب رینے گینوں کی کتابیں پڑھی ہیں۔ فرانس تو مغرب کا دل اور دماغ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت فرانس پر ہوئی ہے کہ رینے گینوں جیسے بزرگ وہاں پیدا ہوئے۔ ان حضرات کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے ہی میں اپنا دوسرا مضمون آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔ یورپ کے خلاف کوئی تحریک چلانے کے بجائے میں تو یہ کوشش کر رہا ہوں کہ یورپ کے ادب اور خصوصاً

ازمنہ وسطیٰ کے ادب کو صحیح طور سے سمجھا جائے اور میرا یقین ہے کہ یورپ کے ادب کو صرف اسلام اور تصوف کے مطالعے کے بعد ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ فرانسیسی مسلمان بھائیوں سے میرا نقطۂ نظر بیان کر دیں۔[مکاتیب عسکری] یہ بھی حقیقت ہے کہ مغرب کے جس فلسفی سے وہ متاثر ہوئے یعنی رینے گینوں انھیں حق مشرق کے ابن عربیؒ کے وسیلے سے ملا تھا اور عسکری صاحب بھی گینوں کے ذریعے ابن عربی تک پہنچے یعنی مغرب کے ذریعے مشرق کی بازیافت ہوئی۔ اس نقطۂ نظر کی تردید کرتے ہوئے ایک صاحب نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اصلاً مشرق کی بازیافت مشرق کے ذریعے ہی ہوئی ہے کیونکہ ابن عربی مغرب کی جاگیر نہیں مشرق کا ورثہ ہے۔ ابن عربی فرانس میں بہت مقبول تھے اور بے شمار اہل علم ان کی تعلیمات سے متاثر ہوئے۔ عسکری صاحب بھی فرانسیسی ادب و فلسفے کے مطالعے سے ابن عربی تک پہنچے۔ ابن عربی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں ''سعید احمد اکبرآبادی سچ کہتے ہیں یا جھوٹ اس کا اندازہ تو اسی سے کر لیجیے کہ دارالعلوم دیوبند کے سو سالہ جشن کے موقع پر حضرت مولانا طیب صاحب نے جو کتاب دیوبند کے عقائد کے متعلق شائع کی ہے اس میں حضرت شیخ اکبر کو دیوبندی عقائد کا ایک ستون قرار دیا ہے۔ اکبرآبادی صاحب لکھتے ہیں کہ انھوں نے اسلام کو نقصان پہنچایا اور حال یہ ہے کہ آج صرف ایک کتاب ''فتوحات مکیہ'' نے سارے مغربی علوم کو شکست دے رکھی ہے اور صرف ایک کتاب کے اثر سے یورپ میں لوگ دھڑا دھڑ مسلمان ہو رہے ہیں''۔ ''دراصل میں نے بھی ''فصوص الحکم'' اسی لیے پڑھی کہ سارتر کے ایک گہرے دوست ہیں ETIEMBLE جن سے بعد میں کھٹ پٹ ہو گئی۔ بہر حال فرانس کے درجہ اول کے ادیبوں میں ہیں۔ ایک زمانے میں وہ اپنے ہر مضمون میں حضرت ابن عربیؒ کا نام لیتے تھے۔ اس لیے مجھے بھی تجسس ہوا''۔ ''دس بارہ سال پہلے تک میں نے کوئی دینی کتاب پڑھی ہی نہیں تھی۔ لیکن فرانس کے ادیبوں نے حضرت ابن عربیؒ کا نام اس طرح لینا شروع کیا کہ بطور فیشن مجھے بھی تجسس ہوا۔ پھر رینے گینوں کی دو ایک کتابیں پڑھ کر اور شوق ہوا۔ چنانچہ ''فصوص الحکم'' اور چند دوسری کتابیں دوسرے حضرات کی پڑھیں۔ یہاں دو باتیں یاد رکھیے۔ ایک تو گینوں کی ابتدائی کتابوں نے یورپ کے لگائے ہوئے بہت سے ذہنی جالے صاف کر دیے تھے۔ دوسرے میں اس زمانے میں بیمار ہو گیا۔ وہ بھی اس طرح کہ چل پھر نہیں سکتا تھا۔ مگر ذہن خوب کام کر رہا تھا۔ اسی وقت گینوں کی سات آٹھ اور کتابیں مل گئیں۔ وہ بھی پڑھتا گیا اور ساتھ ہی حضرت مجدد صاحبؒ کے مکتوبات بھی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی اور غلطیوں سے بچایا۔ اس کے بعد ''فتوحات مکیہ'' پڑھنے کا شوق ہوا''۔[مکاتیب عسکری] رینے گینوں سے عسکری صاحب بے حد متاثر تھے۔ ان کے خیال میں اسلام کا احیاء اور مغربی تہذیب و فلسفے کی شکست گینوں کی فکر اور ان کے مکتب فکر کے ہاتھوں مغرب کا مقدر ہے۔ شمس الرحمان فاروقی کے نام اپنے خطوط میں لکھتے ہیں: ''مسلمان عالموں کی پوری جماعت میں سب سے زبردست آدمی ہیں Rene Guenon۔ کتابیں تو ان کی بیس بائیس ہیں مگر انگریزی میں صرف چھ ترجمہ ہوئی ہیں۔ ان میں سے Crisis of Modren World اور The Reign of Quantity & the Signs of the Times، کو Surrealists نے بیسوی صدی کے بڑے واقعات میں شمار کیا ہے۔ کسی لائبریری میں مل جائیں تو ایک نظر ڈال لیجیے''۔ ''ایک عجیب اتفاق ہے کہ ۴۸ء کے

قریب مولانا اشرف علیؒ نے اپنی مجلس میں کہا تھا کہ مجھے تو یہ نظر آ رہا ہے کہ اب اسلام کی حفاظت کرنے والے یورپ سے پیدا ہوں گے۔ تقریباً یہی زمانہ ہے کہ جب Rene Guenon نے زور وشور سے لکھنا شروع کیا ہے''۔ ''شیخ اکبر کی کتابیں سمجھنے کے لیے ہم جیسے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تو یورپ کے تعصّبات سے چھٹکارا پائیں۔ اس کا صرف یہی ذریعہ ہے کہ Rene Guenon کی دو چار کتابیں پڑھی جائیں۔ (۱) Crisis of the Modern World، (۲) East and West، (۳) Introduction to the Study of Hindu Doctrines [مکاتیب عسکری]

گینوں کی کتابوں سے استفادہ کر کے عسکری صاحب نے ایک کتاب جدیدیت ''مغربی تہذیب کی گمراہیوں کا خاکہ'' لکھی۔ یہ کتاب اپنے اسلوب کے اعتبار سے نہایت سادہ اور مثالی کتاب ہے لیکن اس کا دوسرا حصہ نہایت مشکل ترین حصہ ہے جسے سمجھنے کے لیے یونانی و ہندی فلسفے اور مغربی فکر و فلسفے کے ساتھ ساتھ علوم اسلامی پر بھی گہری نظر ضروری ہے۔ عسکری صاحب نے گینوں کی کتابوں کی مدد سے مغربی تہذیب کی دو سو گمراہیاں دوسرے حصے میں سمو دیں جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کو دور کیے بغیر انگریزی تعلیم پانے والوں کو دین کی باتیں نہیں سمجھائی جاسکتیں۔ مفتی محمد شفیعؒ نے عسکری صاحب کی مرتبہ یادداشت کی بنیاد پر دارالعلوم کراچی کے طلبہ کے لیے اس کی تدریس لازمی قرار دی۔ دو سال تک یہ کتاب ''تخصص دعوۃ فی الارشاد'' کے طلبہ کو پڑھائی گئی۔ عسکری صاحب کے مطابق خیال یہ تھا کہ مولانا تقی عثمانی اس فہرست کو سامنے رکھ کر اپنے طالب علموں کو ایک خاص قسم کا کورس الگ سے پڑھائیں، کسی وجہ سے یہ کورس نہ چل سکا۔ یا ممکن ہے میں نے کچھ لکھا تھا وہی سرے سے غلط ہو۔ [مدیر الحق کے نام عسکریؒ کا خط] عسکری صاحب کی زیر نظر مرتبہ کتاب دو سال تک دارالعلوم کورنگی کراچی کے نصاب میں داخل رہی اور مفتی تقی عثمانی صاحب اس کی تدریس فرماتے رہے، لیکن اچانک اس کتاب کی تدریس موقوف کر دی گئی، اس کے اسباب کیا تھے اس بارے میں دونوں جانب گہرا سکوت پایا جاتا ہے، لیکن دونوں جانب کے ثقہ افراد سے تبادلہ خیالات کے ذریعے تین مختلف نقطۂ نظر سامنے آتے ہیں۔ پہلا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھانے کے لیے ہندی، یونانی اور مغربی فکر، تہذیب اور فلسفہ پر غایت درجے کا عبور درکار تھا، لیکن دینی مدارس اور لادینی اداروں سے کوئی ایسا استاد دستیاب نہیں تھا جو علوم اسلامی اور علوم مغربی، ہندی اور یونانی پر گہری نظر رکھتا ہو۔ عسکری صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ تدریس کریں، لیکن انھوں نے اس بناء پر معذرت کری کہ وہ ہندی اور علوم اسلامی سے قطعاً ناواقف ہیں، لہٰذا یہ ان کا مقام نہیں ہے۔ حضرت مفتی تقی عثمانی نے طوعاً و کرہاً تدریس کی ذمہ داری قبول کی، لیکن ہندی، یونانی اور مغربی فکر و فلسفے سے انھیں مناسبت نہ تھی اور نہ ہی فلاسفۂ مغرب پر ان کی گہری نظر تھی۔ عسکری صاحب سے مسلسل استفادہ کے باوجود رینے گینوں کے فلسفیانہ مباحث کو طلباء تک منتقل کرنا بہت مشکل کام تھا۔ عسکری صاحب کے حلقے کے مطابق دوسرا مسئلہ وہ تھا جس کی جانب عسکریؒ صاحب نے ایک خط میں اجمالی روشنی ڈالی ہے کہ ''مفتی صاحب کے صاحب زادے تقی عثمانی صاحب طباعت کی نگرانی کرتے ہیں، ایک تو وہ انگریزی اچھی طرح نہیں جانتے اور انگریزی

طباعت کا تجربہ نہیں۔[خط بنام محمد حسن مثنّیٰ، مورخہ ۱۶؍ اکتوبر ۱۹۷۵ء] لیکن ہمیں اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں ہے۔ مفتی تقی عثمانی صاحب انگریزی زبان پر عبور رکھتے ہیں، یونانی، مغربی اور ہندی فلسفے پر البتہ انھیں عبور حاصل نہیں۔

بہر حال مناسب استاد نہ ملنے کے باعث مغربی فکر و فلسفے کی تاریخ و گمراہیوں پر مشتمل یہ کتاب دارالعلوم کے نصاب سے خارج کر دی گئی۔ لیکن عالم اسلام کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ غیر معمولی واقعہ تھا کہ کسی دینی مدرسے میں یونانی فلسفے کی جدید ترین شکل مغربی فکر و فلسفے کی باقاعدہ تعلیم و تدریس کا اہتمام کیا گیا۔ اگر یہ تجربہ جاری رہتا تو ہمارے علماء اور دینی مدارس آج مغرب سے اس درجہ مغلوب و مرعوب نہ ہوتے اور مغرب کی الحادی اور بہیمانہ تہذیب اور اس کے خادم اور آلۂ کار کافرانہ اداروں کو سند جواز عطا نہ کرتے۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عسکری صاحب کی سفارش پر مفتی محمد شفیعؒ نے دارالعلوم کورنگی میں رینے گینوں کے افکار و فلسفے سے کشید کردہ نصاب شامل تو کر دیا لیکن انھیں انشراح صدر نہ ہو سکا، چونکہ مفتی صاحب کے حلقے میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو یونانی ہندی اور مغربی فکر و فلسفے پر کامل عبور رکھتا ہو اور رینے گینوں کے نظریات کا اسلامی محاکمہ پیش کر سکے۔ لہٰذا مفتی صاحب نے دیگر حلقوں سے رابطہ کر کے رینے گینوں کے افکار کے بارے میں جاننا چاہا تو انھیں حیرت انگیز معلومات حاصل ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ دبستان روایت کے بانی رینے گینوں فری میسنز سے کئی عشرے وابستہ رہے۔ روایت جدیدیت کا ہی دوسرا رخ ہے۔ مغربی مفکرین اور فلسفی رینے گینوں کو عالم مغرب کے لیے کوئی خطرہ نہیں سمجھتے۔ اسی لیے مغرب میں فکر اسلامی پر جتنی بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں چھوٹے سے چھوٹے اسلامی مفکر کا نام لیا جاتا ہے جس نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو محدود پیمانے پر ہی کیوں نہ متاثر کیا ہو لیکن اس فہرست میں رینے گینوں اور ان کے مکتبہ فکر کے بارے میں ایک سطر بھی نہیں لکھی جاتی۔ یہ مکتبہ فکر وحدت ادیان کا قائل ہے اور خود عسکری صاحب نے گینوں سے متاثر اہم لوگوں مارٹن لنگز اور شواں کی فکر اور کتابوں کو وحدت ادیان کے مسلک کا نمائندہ قرار دیا۔ مزید تحقیق پر جو تفصیلات سامنے آئیں وہ ہوش ربا تھیں۔ ان کا خلاصہ دبستان روایت کے راوی کے لفظوں میں بیان کیا جاتا ہے۔[۱] دبستانِ روایت کا تصورِ دین عالم اسلام کے صحیح دینی تصور کی مطابقت میں نہیں بلکہ اس میں کئی طرح کی ایسی خرابیاں موجود ہیں جو ہمارے دینی تصورات کے خلاف جاتی ہیں۔[۲] شواں، مارٹن لنگز اور دبستانِ روایت سے تعلق رکھنے والے کم و بیش تمام افراد کی کتابوں میں اسلام کو عیسائیت وغیرہ دوسرے منسوخ ادیان کے ساتھ خلط ملط کرنے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش پائی جاتی ہے۔[۳] دبستان روایت شریعت کی بنیادی اہمیت کو نظر انداز کر کے طریقت کو اصل اور شریعت کو فرع قرار دیتا ہے۔[۴] دبستانِ روایت سے تعلق رکھنے والے حضرات روایتی علم تفسیر کے اصولوں کو نظر انداز کر کے بعض آیاتِ قرآنی کا مفہوم اپنی ذاتی رائے سے اخذ کرتے ہیں۔ مفتی صاحب کو اپنے ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گینوں پر GOMBAUT کی کتاب کا خاص اثر تھا۔ وہ فلسفہ ویدانت سے شدید متاثر تھا اور گینوں بھی ویدانت کی گرفت سے کبھی باہر نہ نکل سکے۔ عسکری صاحب نے بھی گینوں کی ہندومت پر کتاب سے خاص استفادہ کیا تھا۔ گینوں مختلف روحانی تنظیموں سے وابستہ رہے لیکن بعد میں اس مادی روحانیت سے متنفر ہو گئے۔ ۱۹۰۶ء میں

گینوں نے خفیہ طور پر اسلام قبول کیا اور ۱۹۳۱ء تک اسلام کو ظاہر نہ کیا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ فری میسن کے رکن بن گئے۔ اسلام قبول کرنے کے باوجود انتقال تک گینوں کی دلچسپیاں فری میسن تحریک سے برقرار رہیں۔ اس تعلق کی مختلف علمی و تحقیقی وجوہات بھی تھیں۔ [AUGUELI] کے ذریعے وہ شیخ علیش الکبیر سے متعارف ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں [AUGUELI] کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اسی سال ان کی شادی عیسائیوں کے رواج کے مطابق انجام پائی۔ اسلام کا اظہار نہیں کیا گیا۔ گینوں پر ALVEYDRE کا خاص اثر تھا، جو فلسفہ اور کبالہ پر متعدد کتابوں کا مصنف تھا اور ایک نئے سماجی نظام کا خالق بھی۔ اس کی کتاب CLEFS-DE L. ORIENT سے گینوں نے روایت ازلی کا وہ تصور اخذ کیا جس کی بنیاد پر دبستان روایت وجود میں آیا۔ اسی مصنف کی ایک اہم کتاب LA MISSION DE L. INDE میں گینوں کو وہ اشارات ملے جس کی بنیاد پر گینوں نے اپنے فکر کو صیقل کر کے LE ROI DU MONDE میں پیش کیا۔ اس فکر کا تعلق ایک ایسے پراسرار مرکز AGARTTHA سے ملتا ہے جہاں سلطان عالم رہائش پذیر ہیں۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ دینے گینوں کا عقیدہ یہ تھا کہ بنیادی روایت ہائی پر بورین ریجنز *[HYPER BORI AN REGIONS]* سے نکلتی ہے۔ دنیا کے سرد ترین خطوں پر مشتمل ایک جغرافیائی خطے سے الہامی روایت کی آمد پر یقین رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ روایت خاص زمان و مکان میں محصور ہے، حسن ظن رکھنے کے باوجود جغرافیائی خطے کی اس حد بندی کو کسی مقدس یا آسمانی کتاب کے معنوں میں نہیں لیا جا سکتا۔ ۱۹۲۹ء میں گینوں نے فری میسنز کے خلاف لکھے گئے ناول پر ہمدردانہ تنقید کی۔ وہ فری میسنز کی اہمیت کے آخر تک قائل رہے۔ گینوں نے ڈاکٹریٹ کے لیے ہندومت پر تحقیقی مقالہ پیش کیا جو منظور نہیں کیا گیا۔ مسترد شدہ مقالہ گینوں کی پہلی کتاب کے طور پر شائع ہوا۔ یہ مقالہ اس لیے منظور نہ ہو سکا کہ یہ ان علمی اور دستاویزی حوالوں اور غیر جانبدارانہ انداز سے نظر سے محروم تھا جو ایسی تحقیق کے لیے ضروری ہیں۔ [عسکری صاحب نے اسی مسترد شدہ مقالے کی بنیاد پر زیر نظر کتاب مرتب کی تھی، لیکن وہ اس تفصیل سے واقف نہ تھے] گینوں وحی الٰہی کے بجائے تعقلی وجدان کو حصول حق کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ دبستان روایت دینی گمراہیوں، فکری خامیوں اور روحانی لغزشوں کا جامع ہے۔

۱۹۰۶ء میں اسلام قبول کرنے کے باوجود ان کے طرز زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں ان کے گھر میں دیوار پر ہندو عورت کی قد آدم تصویر آویزاں تھی جو سرخ مخمل میں ملبوس تھی۔ ان کی اہلیہ اعلیٰ موسیقار تھی اور جب گینوں مطالعے میں مشغول ہوتے تو وہ خاموشی سے پیانو بجاتی رہتی، اس خوابناک ماحول میں ۱۹۳۱ء تک گینوں تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ گینوں [REGNABIT] جریدے سے وابستہ رہے جو عیسائی تصوف اور روحانیات و مقدس تعلیمات کی نشوونما کے لیے وقف تھا۔ یہ رسالہ بعض سیاسی اور قومی مصالح بھی پیش نظر رکھتا تھا۔ ۱۹۲۳ء، ۲۵، ۲۷ اور ۱۹۲۹ء میں گینوں کی معرکۃ الآراء کتابیں منظر عام پر آئیں جو روایت اور مابعد الطبیعیات کے مباحث کو نمایاں کرتی تھیں لیکن روایت کے کسی خاص نظم، تنظیم اور کسی خاص مذہب کی برتری اور حقانیت کی قائل نہیں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ تمام روایتوں کو ایک ہی درجے پر فائز سمجھتے تھے۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ وہ ہندی چینی روایت کو عیسائی روایت سے برتر اور

افضل سمجھتے تھے جب کہ قرآن حکیم نے ادیان عالم کا ذکر کرتے ہوئے واضح طور پر نصاریٰ یعنی عیسائی روایت کو ایک خاص اہمیت دی ہے۔ اس کے برعکس گینوں ہندو تہذیب کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد گینوں نے مادام دینا نامی خاتون کے ساتھ اپنی آبائی جاگیر پر کچھ وقت گزارا اور اس کے ساتھ مصر ہجرت کا ارادہ کیا۔ ۵/مارچ ۱۹۳۰ء کو دونوں مصر چلے گئے، لیکن مادام دینا نے گینوں کو الوداع کہہ دیا۔ اور دوسرے شخص سے نکاح کرلیا۔ ۱۹۳۱ء میں عربی مجلّہ ''المعرفہ'' میں گینوں نے مضامین لکھے اور شاذلی سلسلے کے بزرگ شیخ سلامہ کی مجالس میں حاضری دی، روحانی سفر کی ان منزلوں کے درمیان وہ بے چینی اور بے کیفی کے مرحلوں سے نکل نہ سکے۔ لہٰذا وہ آخر دم تک مسلسل سگریٹ نوشی میں مبتلا رہے۔ ۱۹۳۱ء میں پہلی مرتبہ مصر میں انھوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا اور اپنا نام یحییٰ نورالدین استعمال کرنے لگے۔ وہ تبدیلی مذہب کو کسی مذہب کی دوسرے مذہب پر فضیلت کا عمل نہ سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں تمام مذاہب آفاقی روایت کا تسلسل ہیں لہٰذا ایک روایت کی دوسری روایت پر فضیلت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ تبدیلی مذہب کو روحانی سہولت کا نام دیا جاسکتا ہے اور یہ امر بھی ہر فرد کی انفرادی ترجیح ہے۔ وہ اس بات کے قائل نہ تھے کہ کوئی فائق ترین مذہب تمام موجودہ مذاہب کی جگہ لے۔ وہ صرف ازلی صداقت اور وحدت اصلی کی تلاش کے قائل تھے۔ جس کے نتیجے میں مذاہب کے مابین تمام اختلافات باقی نہ رہیں گے۔ گینوں اپنے اسلام کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ تبدیلی مذہب کا سوال نہیں بہتر سے بہتر انداز میں روحانی تنظیم کا مسئلہ ہے۔ والساں جو شواں کے پیرومرشد تھے ان کی شہادت ہے کہ گینوں نے خود اسلام قبول کیا لیکن وہ ہر قسم کی تبلیغ و اشاعت کے خلاف تھے، گینوں کا خیال تھا کہ مستقبل کا سچا مذہبی انسان مسلمہ مابعد الطبیعیاتی صداقتوں کو مضبوطی سے تھامے گا اور انھی کے مطابق زندگی گزارے گا۔ گینوں کے خیال میں مستقبل کا انسان تمام مذہبی روایتوں کی مروجہ عبادات کی بعض صورتوں اور طور طریقوں کو اپنی مذہبی روایت میں جگہ دے کر ثروت مندی کا سفر طے کرے گا۔ گینوں کے خیال میں روایت کسی ایک امتیازی اور منظّم ضابطہ بندی تک محدود ہونے کی منکر ہے۔ یہی تمام روایتی تعلیمات کا لازمی پہلو ہے۔ اس کے باوجود گینوں کے خیال میں یہ اشد ضروری تھا کہ کسی ایک عظیم روایت پرست مذہب میں فعال و سرگرم شرکت کی جائے۔ جملہ نظامات عقائد مسالک و معتقدات کی ضابطہ بندی قانونی اہمیت و حیثیت کی حامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کا بے باکانہ اظہار کرتے تھے کہ ''یہ دعاوی قطعاً بے معنی اور غیر متعلق ہیں کہ کوئی خاص روایت صداقت کی واحد امانت دار ہے۔ یہ ایسے دعوے ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں دیا جاسکتا''۔ [گینوں کے اسی نقطۂ نظر کی توسیع روایت کے مکتبہ فکر سے وابستہ مفکر گائی ایٹن کی تازہ کتاب میں ملتی ہے جو سہیل اکیڈیمی نے شائع کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ جو ہندو ہے وہ اچھا ہندو بن جائے، جو عیسائی ہے وہ اچھا عیسائی بن جائے، جہاد ممکن نہیں ہے، روحانی تبدیلی کے ذریعے ہی تبدیلی آئے گی وغیرہ وغیرہ] گینوں قیام مصر کے دوران فرانسیسی جریدے LA VOILED SISI میں باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ فری میسن کے جرائد The Speculative Mason اور Cahiersdusud میں بھی کبھی کبھار مضامین لکھتے رہے۔

قیام مصر کے دوران ۱۹۳۱ء، ۳۲، ۴۵، ۴۶ میں ان کی اہم تصانیف منظر عام پر آئیں۔ گینوں کسی نظام فکر کو پیش

نہیں کرتے نہ ہی کسی ازلی روایت کی حاضر وموجود شکل کی تصدیق وتوثیق کرتے ہیں بلکہ وہ صرف فکر ونظر کا افق وسیع کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ہر موجود روایت کو سالم اکائی اور غیر منفک کل کی صورت میں دیکھا جاسکے اور کائنات ظاہر کے معنی و کیفیت کی تشکیل کی جاسکے۔اس کے لیے وحی کی کسی خاص شکل کی ضرورت نہیں ہے۔ان کے فکر ونظر کے خزانے دیو مالائی تخلیقات کو جنم دیتے تھے۔گینوں کے خاص دوستوں میں آنند کمار سوامی شامل تھے۔ ہندومت پر ان کی وقیع تصنیفات شائع ہوئی ہیں۔دونوں مفکرین ایک دوسرے سے بے حد متاثر تھے۔ مابعد الطبیعیات سے گینوں کے یہاں ویدانت کی تعبیرات مراد ہیں۔ یہ بات بھی مفتی صاحب کے علم میں لائی گئی کہ گینوں کی کتابوں میں ایک خاص قسم کا الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ یہ الجھاؤ ابن عربیؒ کی تصانیف کی طرح ہے جس کی وضاحت مختلف مفسرین، مختلف اوقات میں کرتے رہے۔مثلاً حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ............ابن عربیؒ کے الجھاؤ کو تو سلجھایا جاسکتا تھا کیوں کہ وہ شریعت کی خاص تعبیر اور صورت پر ایمان کامل رکھتے تھے اور کتاب الٰہی ذات محبوب الٰہی اور سنت واجماع کے قائل تھے لیکن گینوں کے یہاں ایمان کی یہ صورتیں واضح طور پر محسوس نہیں ہوتیں۔تحریر میں الجھاؤ گینوں کا اختصاص ہے جس کے نتیجے میں کوئی شخص اس قابل نہیں ہوسکتا کہ ان کتابوں کے متون سے ٹھیک ٹھیک اور درست مطالب وخیالات اخذ کرسکے۔گینوں کے یہاں مابعد الطبیعیات روح کے ذریعے روح کے اندر روح کا ادراک ہے۔ یہ ادراک خارجی یا الہامی سہارے کا محتاج نہیں اس منزل کا حصول تعقلی وجدان کے ذریعے ممکن ہے۔گینوں کے خیال میں مغرب ابھی تک اپنی ہی تہذیب میں ڈوبا ہوا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب بحیرہ روم عبور کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔مغرب کا روحانی افلاس مشرق کے مادی افلاس کے مقابلہ میں انتہائی بدترین حیثیت رکھتا ہے۔اس لیے روایت کا احیاء لازمی ہے لیکن اس احیاء کے لیے مغرب کو للکارنے کی کوئی ضرورت نہیں۔گینوں کی فکر کسی تصادم، مبارزت کی قائل نہیں یہی وجہ ہے کہ گینوں کے مقلدین نہ کسی اسلامی حکومت کا کوئی تصور رکھتے ہیں نہ جہاد کو ممکن سمجھتے ہیں اس لیے گینوں صرف دیکھو اور انتظار کرو کی حکمت عملی کی دعوت دیتے ہیں جس کا براہ راست تعلق ہندی دیو مالا سے جڑ جاتا ہے۔عسکری صاحب کے یہاں بھی اس نقطۂ نظر کی جھنکار ڈاکٹر حمید اللہ کے نام خط میں مل جاتی ہے جس میں وہ حمید اللہ صاحب کے توسط سے یورپ والوں کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہ یورپ کے خلاف کوئی تحریک نہیں چلا رہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''میرا مقصد مغرب پر حملہ کرنا نہیں تھا''۔[اگر عسکری صاحب اور رینے گینوں جیسے اکابرین مغرب پر حملہ نہیں کریں گے تو پھر حملہ آور کس تہذیب سے برآمد ہوگا] گینوں کی فکر فلسفے پر آنند سوامی کمار، ALVEYDRE اور GOMBAUT وغیرہ کے زیر اثر ہندومت سے غایت درجے کی عقیدت اور ہندو فلسفے سے حد درجہ شیفتگی عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔اس کی تفصیلات جب مفتی شفیعؒ کے علم میں آئیں تو وہ متوحش ہوگئے۔ یہ تفصیلات کسی اور موقع پر بیان کی جائیں گی لیکن ان کا اختصار روایت کے مکتبہ فکر کے ایک مستند شارح کے لفظوں میں کئی برس پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔

گینوں کا کہنا ہے کہ ''ہندو ظہور کے ایک مکمل دائرے کو جسے وہ من ونترا کہتے ہیں۔چار حصوں میں تقسیم کرتے

ہیں۔ست یگ، پراپت یگ، دوار پت یگ اور کل یگ، ست یگ سب سے پہلے آتا ہے۔اور یہ سب سے اچھا زمانہ ہوتا ہے۔کیونکہ اس میں حقیقت کا عرفان سب کو مکمل طور پر حاصل ہوتا ہے۔ پراپت یگ میں حقیقت پوشیدہ ہونا شروع ہوجاتی ہے اور اس کا عرفان ہر ایک کو حاصل نہیں ہوسکتا۔دوار پت یگ میں حقیقت اور زیادہ چھپ جاتی ہے اور اس کا عرفان مشکل تر ہوجاتا ہے۔آخر میں کل یگ آجاتا ہے۔ جب حقیقت کا عرفان بہت ہی زیادہ دشوار ہوجاتا ہے اور آخر میں بالکل ہی غائب ہوجاتا ہے۔حقیقت کے عرفان کے ساتھ لوگوں کے اعمال میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہے۔اور ست یگ کا خیرِ محض کل یگ کے شرِ محض میں بدل جاتا ہے۔یہ چاروں دورظہور کے دائرے کی تکمیل کے ضروری اجزاء ہیں۔ پھر جب ایک دائرہ مکمل ہوجاتا ہے تو کل یگ کے بعد جو حقیقت بالکل چھپ گئی تھی، ایک بار پھر ظاہر ہوجاتی ہے اور ظہور کا دوسرا دائرہ شروع ہوجاتا ہے۔ گینوں کے مطابق مغرب کی موجودہ تہذیب کل یگ کے آخری دور کی تہذیب ہے۔ساری روایتی تہذیبیں ایک ایسے وقت کی پیش گوئی کرتی ہیں جب دنیا سے روشنی بالکل غائب ہوجائے گی اور صرف اندھیرا باقی رہ جائے گا۔[یہ تصور بھی باطل تصور ہے۔قرآن روشنی ہے جو باقی رہے گا، خواہ ظلمت کتنی کیوں نہ ہو اس چراغ کی روشنی میں صرف اندھیرے کا یقین محض مشرکانہ تصور ہے] موجودہ مغربی تہذیب اس اندھیرے کی تہذیب ہے اور علامتی طور پر مشرق کے مقابلے پر اس سمت کو ظاہر کرتی ہے جس سمت میں سورج غروب ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ کے اس تصور کے مطابق مغربی تہذیب کی پیدائش تاریخ کا ایک لازمی حصہ ہے اور اسے کسی طرح روکا نہیں جاسکتا۔اس کا ظہور اسی طرح ضروری ہے جس طرح ست یگ کا ظہور۔اس لازمی ظہور کے باعث رینے گینوں کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب سے لڑنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ جو کام ہم کرسکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ مشرق اور مغرب اور روایت اور غیر روایت کے فرق کو سمجھ لیں اور حقیقت کے روایتی تصور کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنے کی کوشش کریں۔ یہ کوشش ایک خاص وجہ سے بہت ضروری ہے۔رینے گینوں کا کہنا ہے کہ غیر روایت اتنی کمزور چیز ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس وقت تک قائم نہیں رکھ سکتی جب تک روایت کے کچھ اجزاء اپنے اندر شامل نہ کرے۔ مذہبی انداز میں یوں کہنا چاہیے کہ غیر روایت باطل ہے اور روایت حق، باطل کی حقیقت باطل ہے اس لیے باطل باطل کی حیثیت سے کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔باطل کا قائم رہنا صرف اس وقت ممکن ہے جب اس میں حق کی تھوڑی بہت آمیزش کی گئی ہو۔ چنانچہ باطل اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لیے حق کا سہارا لیتا ہے۔رینے گینوں کے نزدیک باطل کو شکست دینے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ حق کو باطل سے الگ کردیا جائے۔کل یگ کے آخری دور میں سب سے بڑا انسانی فریضہ حق و باطل کے التباس کو دور کرنا ہے۔رینے گینوں کہتے ہیں کہ مشرق و مغرب کو اس طرح سمجھ کر ہم اس وقت کی تیاری کرسکتے ہیں جب کل یگ ختم ہوکر ظہور کا نیا دائرہ شروع ہوگا''۔اس فلسفے کے تحت مغرب سے مبارزت طلبی ختم ہوجاتی ہے۔مجاہدین کی پیکار لایعنی اور بے معنی ٹھہرتی ہے۔ جہاد ناممکنات میں شامل ہوجاتا ہے۔اسلامی ریاست کا قیام محال ہوجاتا ہے۔مغرب کائنات کی تقدیر بن جاتا ہے جس کے آئینے میں ہر تہذیب اپنی صورت گری کرنے پر مجبور ہے۔ دیکھو اور انتظار کرو کی حکمت عملی قوائے عمل کو شل کردیتی ہے۔کل یگ اگر دو چار سال کی بات ہوتا اور ''من ونترا'' دس بیس برس کا قصہ ہوتا تو اسے گوارا کیا جاسکتا تھا۔

ساحل نومبر ۲۰۰۵ء

گینوں کا کائناتی چکر [Cosmic Cycle] کی ہندو تعبیر پر یقین رکھتے تھے جس میں ہر گردش ایک طویل نزول کے بعد پچھلے چکر کی نسبت اونچے چکر پر ختم ہوتی ہے۔ ویدانتی تعلیمات میں سب سے جامع دور یا چکر KALPA ہے جس کی مثال موجودہ دنیا ہے۔ یہ چکر چودہ مان ونتروں میں تقسیم ہے۔ موجودہ چکر میں ہم ساتویں مان ونتر کے اختتام کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ اس نظام میں ہر مان ونتر ۶۴۸۰۰ سال کا ہے۔ حساب کتاب کے ایک اور نظام کے تحت KALPA کو ایک ہزار مہایوگوں ''ازمنہ ہائے عظیم'' میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں ہر یوگ کی مدت بارہ ہزار سال ہے۔ مہایوگ آگے پھر چار یگوں میں تقسیم ہے۔ حساب کتاب کے اس گورکھ دھندے کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ مغربی تہذیب کا یہ چکر کبھی ختم نہ ہوگا لہٰذا اس تہذیب کے سامنے سر تسلیم خم کرلیا جائے اور اسے ناقابل شکست تہذیب سمجھ لیا جائے۔ کیوں کہ جو مدت بیان کی جارہی ہے وہ صبح قیامت ہی ختم ہوسکے گی۔ اس ساعت کی آمد سے قبل مغربی بہیمیت کی قیامت کو صبر وشکر سے برداشت کرنا انسانیت اور خصوصاً امت مسلمہ کا مقدر ہے۔ ان افکار سے شناسائی کے باعث اس کتاب کی تدریس دارالعلوم کورنگی میں ممنوع قرار پائی۔

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ عسکری صاحب نے یہ کتاب تقی عثمانی صاحب کی فرمائش پر لکھی تھی ۱۹۸۲ء میں اس کتاب کی اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے تقی عثمانی صاحب نے البلاغ [شمارہ ۱۴۰۱ محرم الحرام] میں اس کا اظہار بھی کیا ہے اس تبصرے میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ گینوں کی فکر بے آمیز نظر آتی ہے اس کتاب کے مطالعے سے دینی مدارس کے اساتذہ مغربی گمراہیاں سمجھ سکیں گے ہر اس شخص کو یہ کتاب پڑھنی چاہیے جو مغرب سے واقف ہونا چاہتا ہے اس کتاب کو دارالعلوم میں پڑھایا گیا۔ ہم دینی مدارس کے طلباء و اساتذہ سے اس کتاب کے مطالعے کی بھرپور سفارش کرتے ہیں۔ اس تبصرے میں تقی عثمانی صاحب نے اس بات کی وضاحت نہیں فرمائی کہ اگر یہ کتاب اس قدر اہمیت کی حامل تھی تو اس کی تدریس گزشتہ ۳۳ تینتیس برس سے دارالعلوم میں کیوں موقوف ہے؟ اگر یہ کتاب اس قدر اہمیت کی حامل تھی تو اسے وفاق المدارس کے نصاب میں کیوں شامل نہیں کیا گیا جبکہ ''اسلام اور جدید معیشت'' کو وفاق کے نصاب میں باقاعدہ طریقے سے شامل کرایا گیا محمد حسن عسکری صاحب کے انتقال پر تقی عثمانی صاحب نے البلاغ [ربیع الاول ۱۳۹۸ ہجری] میں ''میرے بزرگ دوست محمد حسن عسکری'' کے عنوان سے تعزیتی مضمون تحریر فرمادیا تھا لیکن اس مضمون میں بھی رینے گینوں کی فکری گمراہیوں کا ذکر نہیں کیا گیا نہ ہی ان اسباب پر روشنی ڈالی گئی جس کے باعث عسکری صاحب کی کتاب کی تدریس روک دی گئی یہ سوال بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ اگر عسکری صاحب کی یہ کتاب اس قدر اہم تھی تو اسے مکتبہ دارالعلوم یا اس سے وابستہ ادارہ اسلامیات اور دارالاشاعت نے کیوں شائع نہیں کیا جب کہ یہ اہم اور فروخت ہونے والی کتاب تھی یہ کتاب پہلی اور آخری بار ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی اس کے بعد آج تک اس کتاب کی اشاعت کی نوبت نہ آئی نہ ہی اس کتاب کا ترجمہ انگریزی اور عربی میں کرایا گیا جب کہ تقی عثمانی صاحب کی ہدایت پر اس عرصے میں کچھ کتابوں کے تراجم ہوئے۔ دارالاشاعت تو ہندوستان کے جدیدیت پسند مفکر مولانا وحیدالدین خان کی انگریزی کتابیں بھی شائع کرکے برآمد کررہا ہے

مولانا سمیع الحق مدیر الحق کے نام عسکری صاحب نے خط میں اس کتاب کے بارے میں واضح طور پر تحریر کیا تھا کہ ”یہ کتاب انھو ں نے خود مرتب کی تھی یعنی کسی کی فرمائش پر تحریر نہیں کی لہذا یہ نقطۂ نظر کہ یہ کتاب مفتی تقی عثمانی صاحب کی فرمائش پر تحریر کی گئی درست نقطۂ نظر نہیں ہے اس خط میں عسکری صاحب نے یہ بھی تحریر کیا تھا کہ رینے گینوں ۱۹۳۷ء میں مصر چلے گئے اور ۱۹۵۲ء میں ان کی وفات ہوئی یہ دونوں تاریخیں غلط ہیں رینے گینوں ۱۵ نومبر ۱۸۸۸ء کو پیدا ہوئے ۱۹۳۰ء میں مصر تشریف لے گئے اور ۷ جنوری ۱۹۵۱ء کو انتقال فرما گئے ۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رینے گینوں کی تمام تصانیف عسکری صاحب کے مطالعے سے نہیں گزریں اس کا ثبوت محمد حسن عسکری پر سلیم احمد کی کتاب ہے جس میں عسکری صاحب کی جانب سے مغرب کو مکمل رد کرنے کے نتائج وعواقب پر نظر ڈالتے ہوئے سلیم احمد لکھتے ہیں کہ عسکری صاحب جب مشرق مغرب کے امتزاج کی بات رد کرتے ہیں تو حالی سے غلام احمد پرویز تک سب کی جڑ کٹ جاتی ہے اور ساتھ ہی ہماری بھی۔ عافیت کے قلعے پر حملہ کر کے عسکری صاحب ہمیں تنہا چھوڑ دیتے ہیں ۔ہم مغربی نہیں ہیں، اور مغربی ادب پیدا کریں تو انجام موت، ہم مذکورہ صورت حال کی روشنی میں مشرقی رہنا چاہیں اور مشرقی ادب پیدا کریں تو ناممکن ہم مغرب کو رد کر کے اس مشرق کی طرف لوٹنا چاہیں جو پیروی مغرب سے پہلے تھا تو راستہ بند، یا اللہ پھر ہم کیا کریں، میں نے یہ سوال عسکری صاحب کی زندگی میں ان سے پوچھا تھا زبانی بھی اور تحریری بھی ۔تحریری کا تو جواب انھوں نے نہیں دیا لیکن زبانی کہا تھا نماز پڑھو......عسکری صاحب کے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا لیکن عسکری صاحب کے شیخ رینے گینوں نے اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور دراصل عسکری صاحب کے خیالات کو سمجھنے کے لیے گینوں کا مطالعہ ضروری ہے ۔گینوں نے تینوں سوالات کا جواب یہ دیا ہے کہ مغرب کو اختیار کرنا، باطل کو اختیار کرنا ہے دونوں کی آمیزش کے معنی حق و باطل کو ملانا ہے جو باطل کا کام ہے مشرق کو قائم رکھنے کے معنی حق کو حق سمجھنا اور باطل کو باطل سمجھنا اور دونوں کے التباس کو رد کرنا ہے، عسکری صاحب کو رینے گینوں کا یہ جواب معلوم نہ تھا۔اگر سلیم احمد کے اس بیان کو درست تسلیم کر لیا جائے تو یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ عسکری صاحب نے گینوں کے اس بہت کچھ لکھے ہوئے کو نہیں پڑھا جہاں عسکری صاحب کے سوالات کا جواب موجود تھا گویا عسکری صاحب کو گینوں کی مکمل تفہیم میسر نہ تھی لیکن اس بیان پر یقین کرنا بہت مشکل اور صبر آزما مرحلہ ہے لیکن حقیقت یہی ہے ۔ بیدل لائبریری میں عسکری صاحب کی کتابیں محفوظ ہیں فہرست کتب کے مطابق اس ذخیرے میں رینے گینوں کی پانچ فرانسیسی کتابیں محفوظ ہیں اور دو چار انگریزی ترجمے جو انہی کتابوں کے ہیں اس ذخیرے میں شیخ الازہر عبدالحلیم محمود کی عربی کتاب ”الفیلسوف المسلم“ موجود ہے جو عالم دین کے قلم سے رینے پر پہلی کتاب ہے ۔گینوں پر راسخ العقیدہ علماء نے قلم نہیں اُٹھایا چند برس پہلے مولانا زاہد الراشدی کے ورلڈ اسلامک فورم کے جنرل سیکریٹری جناب عیسیٰ منصور صاحب نے گینوں پر ایک مختصر کتاب لکھی لیکن یہ کتاب گینوں کے افکار کا ناقص احاطہ بھی نہیں کرتی مولف مغربی فکر و فلسفے اور ہندی فلسفے کے مباحث سے ناواقف ہیں اس لیے کتاب کسی علمی مقام کی حامل نہیں ۔

ذیل میں مدیر الحق عسکری کے نام رینے کے خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے جو ہمارے اس موقف کی تائید کرتا ہے کہ

عسکری صاحب نے جدیدیت پر اپنی کتاب خود اپنی تحریک پر لکھی تھی تقی عثمانی صاحب کی فرمائش پر نہیں لکھی: ''رینے گینوں کی کتابوں کی مدد سے کوئی دو سو گمراہیوں کی فہرست مرتب کی تھی جو ہمارے یہاں رائج بھی ہو چکی ہیں اور جنھیں دور کیے بغیر انگریزی تعلیم پانے والوں کو دین کی باتیں نہیں سمجھائی جاسکتیں یہ فہرست میں نے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی''۔ [مکاتیب عسکری، ص ۱۶۷]

روایت کا مکتبہ فکر جدیدیت کی دوسری شکل ہے یا نہیں یہ ایک تفصیلی موضوع ہے لیکن یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ عسکری صاحب جدیدیت کے ریلے سے نکلنے اور تصوف کی وادی میں داخل ہونے کے باوجود جدیدیت کے بعض مظاہر سے چھٹکارا نہ پا سکے۔ مثلاً مجدد الف ثانیؒ، اشرف علی تھانویؒ کی علمی صحبت اور مفتی شفیعؒ کی رفاقت کے باوجود وہ رینے گینوں کو راسخ العقیدہ اور فکر اسلامی سے وابستہ فرد سمجھتے رہے۔ ان کی ذاتی زندگی بھی علوی جذبات سے مملو نہ ہو سکی۔ مثلاً فکری سطح پر وہ اسلامی سوشلزم کے قائل رہے اور ذوالفقار علی بھٹو کو عالم اسلام کا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ جبکہ مفتی شفیع صاحب نے ۱۹۷۰ء کے انتخاب میں اسلامی سوشلزم کے کفر کا فتویٰ جاری کیا تھا اور دینی جماعتوں کو ووٹ دینا دینی فریضہ قرار دیا تھا۔ عملی سطح پر عسکری مرحوم مغربی جمالیاتی ذوق سے اوپر نہ اٹھ سکے وہ موسیقی کی محفلوں کا خصوصی اہتمام کرتے تھے اور اس سے حظ اٹھاتے تھے۔ عمر میمن اور حسن مثنّٰی کے نام ۱۹۷۵ء کے خطوط جو عسکری صاحب کے آخری زمانے کے خطوط ہیں اس موقف کی تائید کرتے ہیں۔

''جی ہاں، گانے تو اور بھی بہت سے ٹیپ کیے ہیں۔ مگر آپ کو کیسے بھیجوں؟ کوئی جانے والا ملے تو آسانی ہو''۔ [۱۹۷۵ء] ''ان شاءاللہ آپ کے لیے استاد بندو خاں کے گانے ٹیپ کرانے کا انتظام اب ہو جائے گا۔ کوئی آتا جاتا ہو تو پندرہ دن پہلے اطلاع دیجیے گا''۔ [۱۹۷۵ء] ''پھر آپ نے ٹیپ میں استاد امراؤ بندو خاں کے گانے بھروانے کی فرمائش کی تھی۔ میں اس فکر میں رہا کہ کوئی انتظام ہو جائے۔ ہمارے حلقے میں جو صاحب اس کام کے ماہر ہیں وہ بہت مصروف رہے ہیں اور ابھی مصروف رہیں گے۔ اس لیے فی الحال تو بندوبست نہیں ہو سکا۔ آپ کے جو ملاقاتی امریکہ جانے والے ہیں وہ تو غالباً جون میں واپس چلے جائیں گے۔ اس وقت تک کام نہیں ہو سکتا۔ ان شاءاللہ آئندہ میں آپ کے لیے ٹیپ تیار کرا دوں گا۔ یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ آپ جو ٹیپ لے گئے تھے وہ آپ کے کام آیا''۔ [۱۹۷۵ء] ''مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ اب امریکہ میں ہیں یا کینیڈا میں۔ پرسوں استاد بندو خاں مرحوم کی برسی منائی گئی۔ تقریباً ساری رات محفل چلتی رہی''۔ [۱۹۷۵ء] ''مثنّٰی تمہارا ٹیپ ریکارڈ کیسا چل رہا ہے؟ ہم تو صرف کلاسیکی موسیقی اور مباحثے ریکارڈ کرتے ہیں''۔ [۱۹۷۵ء] عسکری صاحب نے گینوں کی گمراہیوں کے بارے میں کبھی ایک سطر بھی نہیں لکھی، وہ انھیں راسخ العقیدہ عالم سمجھتے تھے۔

عسکری صاحب کی آخری تالیف وتصنیف ''جدیدیت'' کے ماخذ پر ان تمام مباحث کے مطالعے کے باوجود اس کتاب کی اہمیت اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور اس کا مطالعہ ہمیں مغرب کے بارے میں بعض اہم باتوں سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ خصوصاً مطالعے کا مستحق ہے۔